

علتِ مرض — اور اس کا علاج

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ
أَيْدِي النَّاسِ (۱۳۰)

انسانوں کے خود ساختہ نظامِ زندگی کا نتیجہ ہے کہ ساری دنیا میں تباہیاں مچ رہی ہیں۔

کہتے ہیں کہ انسان کی تمدنی زندگی کا آغاز آج سے قریب چھ ہزار سال پہلے ہوا۔ اربابِ علم و تحقیق، انسانی تاریخ کے اس چھ ہزار سالہ دور کے متعلق جو کچھ کھوج لگا سکے ہیں، اس سے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگرچہ اس کی تاریخ، خوں ریزیوں اور فسادِ انگیزیوں کی ایک مسلسل داستان ہے۔ لیکن جس انداز کی تباہی موجودہ زمانے میں رونما ہوئی ہے، اس کی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔ اس سے پہلے جو تباہیاں آتے تھے، ایک تو وہ کسی خاص خطہ زمین تک محدود ہوتی تھیں، اور دوسرے ان کے نتائج و عواقب اتنے دور رس نہیں ہوتے تھے۔ عصرِ حاضر میں، وسائل و رسائل کی وسعت و کثرت کا نتیجہ ہے کہ جو آگ کسی ایک خطہ زمین میں بجھتی ہے، اس کے شعلے (بالا واسطہ) پورے کے پورے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ اور اب تو شاید یہ شعلے ابھر کر اجرامِ فلکی تک کو بھی محیط ہو جایا کریں گے۔ دوسری طرف، ان شعلہ خیز لوں اور شرابیوں کے انجام و عواقب وقتی اور منگامی نہیں ہوتے، یہ آنے والی نسلوں تک مسلسل پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ وہ مکان فراموش اور زمان نا آستان تباہیاں جن کا نقشہ قرآن کریم نے اس آیتِ جلیلہ کے چار الفاظ میں نہایت جامعیت سے کھینچ کر رکھ دیا ہے جو زیرِ عنوان ہے۔

جو اربابِ علم و بصیرت، انسانیت کا درد اپنے دل میں رکھتے ہیں، وہ اس صورتِ حال سے انتہائی دل گرفتہ اور آہ بلب رہتے ہیں اور ان تباہیوں کے اسباب و علل دریافت کرنے کے لئے مصروفِ تحقیق و تدقیق۔ لیکن ان کی اس تمام سعی و کاوش کی کیفیت یہ ہے کہ وہ آج جس نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ اور اس کا علاج اس طرح سے کرتے ہیں گویا انہوں نے اس فرد میں گم گشتہ کا سراغ پالیا ہے جس کی تلاش میں، جنت سے نکالا ہوا ابنِ آدم، مارے مارے پھر رہا ہے۔ لیکن ہنوز اس جشی مسرت کی شب چراغاں کی سحر بھی نہیں ہونے پائی کہ اس تشخیص و تدبیر کے نتائج اس کی ناکامی کے ماتم گسار بن جاتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ وہ سیاسی

نظام ہے جس سے قوموں کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے اور باہمی آویزشوں کا موجب بنتے رہتے ہیں۔ کہیں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا باعث وہ معاشی نظام ہے جس سے طبقات وجود میں آتے ہیں اور طبقاتی نزاع ان کے باہمی تضادات کا موجب بنتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کی وجہ حکومتوں کی انتظامی مشینری کی کمزوری ہے جس سے لانا لوینٹ کی روک تھام نہیں ہوتی اور کوئی اسے نظام تعلیم و تربیت کی خرابی پر محمول کرتا ہے جس سے نوجوانوں میں جنسی بہنہادیاں اور سرکشی و قانون شکنی کے رجحانات عام ہوتے چلے جاتے ہیں۔ سطحی نگاہ سے دیکھئے تو یہ اسباب موجودہ لے لاہروی اور عالمگیر تباہیوں کے بڑے مؤثر عوامل دکھائی دیں گے۔ لیکن سطح سے ذرا نیچے اتر کر دیکھئے تو یہ اسباب صرف علامات مرض ثابت ہوں گے، علت مرض نہیں۔ اور علت مرض تک یہ دیدہ وریہی نہیں رہے۔ اس کی وجہ ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔

قرآن کریم، علامات مرض سے بحث نہیں کرتا، وہ علت مرض کی نشاندہی کرتا ہے جب کہتا ہے کہ **إِنَّ اللَّهَ لَا يَغَيِّرُ مَا يَفْعَلُ حَتَّىٰ يُعَيِّرَ مَا بِأَنْفُسِهِمْ** (۱۳۱) یعنی قوموں کی زندگی کی عمارت اس کے نظریہ حیات کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ جو اس میں نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ جس قسم کا نظریہ حیات اسی قسم کی نفسیاتی تبدیلی اور جس قسم کی نفسیاتی تبدیلی اسی قسم کے خارجی نتائج۔ اسباب و علل کی ان کڑیوں کی رو سے غلط نظریہ حیات کا لازمی نتیجہ تباہیاں اور بربادیاں ہوتا ہے اور صحیح نظریہ حیات کے فطری برگ و بار کی سر فرازیاں اور خوشگواریاں۔ قرآن کریم کی اس تشخیص کی رو سے، عصر حاضر کی تباہیوں کی بنیادی اور اساسی وجہ وہ نظریہ حیات ہے جس نے اس وقت عالم گیر حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔

یہ نظریہ حیات کیا ہے؟ یہ کہ انسانی زندگی دیگر حیوانات کی طرح، محض طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے۔ انسان، طبیعی قوانین کے مطابق، حیوانات کی طرح، کھاتا، پیتا، افزائش نسل کرتا اور اس کے بعد مرجھاتا ہے۔ اور جب وہ مرجھاتا ہے تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں **وَالسَّيِّئِينَ كَفَرُوا وَيَسْتَفْعُونَ رَبَّهُمْ لَنُؤْتَهُمْ بِمِثْلِهِمْ** (۱۳۲) یہ لوگ، جو حیوانی زندگی سے بلند زندگی کے قائل نہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ حیوانات کی طرح کھاتے پیتے (اور بالآخر مرجھاتے ہیں) دوسری جگہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ **أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَثَلٌ** (۱۳۳) یہ لوگ حیوانات کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی سگے گزرے۔ یہ بَلْ هُمْ أَثَلٌ۔ ایک گہری حقیقت کا ترجمان ہے۔ حیوانات پر فطرت نے خود پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ جنہیں ان کی جبلت کہا جاتا۔ اور حیوانات کو اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ ان پابندیوں کو توڑ سکیں۔ لیکن انسان پر فطرت نے کوئی کنٹرول نہیں رکھا۔ دوسری طرف اس کی قوتیں بھی لانتہا ہیں۔ اب آپ کسی ایسے حیوان کا تصور ذہن میں لائیے جسے لامحدود قوتیں حاصل ہوں اور ان قوتوں کو وہ جس طرح جی چاہے استعمال کرے۔ اس پر اس باب میں فطرت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہ ہو۔ نیز، وہ حیوان کسی جنگل میں اکیلے نہ ہو۔ اس قسم کے بہت سے۔ ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں حیوان ہوں اور ان سب نے اکٹھے رہنا ہو۔ اس کے بعد سوچئے کہ اس کا نتیجہ خوں ریزیاں اور فساد انگیزیاں نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا!

انسانی قوت کے استعمال پر پابندیاں، سوسائٹی کی طرف سے عائد ہوتی ہیں اور سوسائٹی خود اپنی افراد کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے۔ اسے بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ انسان خود مل بیٹھ کر طے کرتے ہیں کہ ہمیں کس قسم کی پابندیوں کے تابع زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے، کہ یہ انسان ان پابندیوں کو ملحوظ رکھیں۔ یہ بھی طے کر لیا جاتا ہے کہ ان میں سے جو شخص ان پابندیوں کو توڑے گا، اسے یہ سزا ملے گی۔ اسے سوسائٹی کا قانون بدل کہا جاتا ہے۔ اس قانون بدل کو بروئے کار لانے کے لئے سوسائٹی ایک مشینری وضع کرتی ہے جسے انتظامیہ (پولیس وغیرہ) کہا جاتا ہے۔ اس انتظامیہ کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ معاشرہ کے ایک ایک فرد کے سر پر ایک ایک نگران مقرر کرے جو ہر وقت دیکھتا رہے کہ وہ ان قوانین کی پابندی کرتا ہے یا نہیں۔ یہ اس انتظام کا پہلا نقص ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو قانون شکنی انتظامیہ کی نگاہوں سے اوجھل رہے، اس پر کسی قسم کی گرفت نہیں ہو سکتی۔ عقل حیلہ گرانسان کو سینکڑوں ایسی تدابیر سمجھا دیتی ہے جن سے اس کی قانون شکنی کسی کی گرفت میں نہ آ سکے۔

اس انتظام کا دوسرا نقص یہ ہے کہ خود انتظامیہ کی مشینری بھی اپنی جیسے انسانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جو اپنے مفاد کی خاطر، قانون شکنی سے کساح برتنے یا ان سے تعاون کرنے لگ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں قانون شکنی عام ہو جاتی ہے۔ اتنی عام کہ اس کی روک تھام سوسائٹی کے بس میں نہیں رہتی اور اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ خود اس قانون ہی کو منسوخ قرار دے دے۔ سوسائٹی کی اس بے بسی سے قانون کا احترام ہی باقی نہیں رہتا۔

یہ تو یہی پابندیوں کی عدم پابندی۔ جہاں تک حسن اخلاق کا تعلق ہے، اس نظریہ زندگی کی روش سے، اس کے لئے کوئی جذبہ محرکہ ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً قانون کی روش سے آپ لوگوں کو اس کے تو پابند کر سکتے ہیں کہ وہ کسی کے دل چوری نہ کریں۔ لیکن دنیا کا کوئی قانون انہیں اس بات پر مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ کسی محتاج کی امداد کریں۔ اس کا تعلق حسن اخلاق سے ہے۔ اور طبیعی نظریہ زندگی کی روش سے، کوئی شخص اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ میں کسی محتاج کی مدد کیوں کروں؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تم محتاج کی مدد اس لئے کرو کہ اگر کل کو تم محتاج ہو جاؤ، تو دوسرا تمہاری مدد کرے۔ لیکن یہ جواب جس قدر بوجہ اور جذبہ جس قدر کمزور ہے، وہ ظاہر ہے۔ اگر ایک شخص اس کا انتظام کر لے کہ اسے کسی کی امداد کی ضرورت ہی نہ پڑے تو اس کے لئے یہ دلیل بے بنیاد ہو جاتی ہے۔ دراصل، یہ دلیل حسن سلوک کے لئے جذبہ محرکہ نہیں بلکہ کاروباری فہمیت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے۔ یعنی میں کسی کو کچھ دوں تاکہ کل کو عند الضرورت وہ مجھے کچھ دے۔ یہ خالصتہً بزنس ہے۔ یہ تو رہا ایک قوم کے اندر افراد کا باہمی معاملہ۔ جہاں تک اقوام کا باہمی معاملہ ہے حیوانی نظریہ زندگی کی روش سے، کوئی حوالہ ایسے مؤثر نہیں ہو سکتے جو کسی بالادست قوم کو کمزور قوم پر دست درازی کرنے سے روک سکیں۔ اقوام عالم نے بین الاقوامی امور کے تصفیہ کے لئے پہلے لیگ آف نیشنز کی طرح ڈالی تھی اور اس کی ناکامی کے بعد اب اقوام متحدہ کی تشکیل کر رکھی ہے۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ وہاں بھی بالادست قوتوں کی کار فرمائی ہے۔ زیر دستوں کی کچھ شہنائی نہیں ہوتی۔ اور یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں۔ حیوانی نظریہ زندگی میں ”جنگل کے قانون“ سے برتر کوئی قانون ہو نہیں سکتا۔ اور جنگل کا قانون یہی ہے کہ ہر زبردست، بالادست کا شکار ہوتا ہے۔

اب آپ نے غور فرمایا کہ اس وقت عالم گیر تباہیوں نے جس بُری طرح سے نوع انسان کو گھیر رکھا ہے، اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ اس کی بنیادی وجہ ہے حیوانی نظریہ زندگی۔ اسی کو مادی نظریہ حیات یا (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کہتے ہیں۔ یہ نظریہ یوں تو قدیم ایام سے چلا آ رہا تھا، لیکن انیسویں صدی عیسوی میں اس نے یورپ میں نمایاں شہرت حاصل کی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اس نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جو مذہب پرست طبقہ، زبانی اس نظریہ کی مخالفت کرتا ہے، عملاً وہ بھی اسی کا پیرو ہے۔ ان کی وجہ اختصار چند مذہبی رسوم سے زیادہ کچھ نہیں۔ اکبر کے الفاظ میں یہ شیخ صاحب وہی کرتے ہیں جو سب کرتے ہیں یہ الگ بات ہے، ہم ان کا ادب کرتے ہیں

(۰)

اس کے برعکس، قرآن کریم انسانی زندگی کا ایک اور نظریہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی زندگی محض طبیعی زندگی نہیں۔ اس کے اندر ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ وہ نہ طبیعی قوانین کی پیداکردہ ہے، نہ طبیعی قوانین کے تابع۔ اور نہ ہی انسان کی طبیعی زندگی کے ختم ہو جانے کے ساتھ (جسے موت کہا جاتا ہے) اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ اسے حیاتِ آخرت کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسانی جسم کی نشوونما یا اضمحلال و انحطاط، طبیعی قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن ذات کی نشوونما یا ضعف و انحطاط، مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً انسان اگر اچھی غذا کھاتا ہے تو اس سے اس کے جسم کی عمدہ پرورش ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ غذا، نا جائز دولت سے حاصل کردہ ہوتی ہے تو اس سے اس کی ذات کمزور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح، انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے۔ اس کا جو عمل اقدارِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے جو اس کے خلاف ہوتا ہے، اس سے اس کی ذات میں ضعف اور انتشار واقعہ ہو جاتا ہے۔ انسانی اعمال کے اثرات اس کی ذات پر ان خود مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے لئے کسی خارجی مشینری کی ضرورت نہیں ہوتی۔

تصویحات بالا سے واضح ہے کہ انسانی اعمال اور ان کے اثرات کو تین شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

- ۱۔ ایسے اعمال جن کا اثر طبیعی ہوتا ہے، اور وہ محدود ہوتا ہے فرد متعلقہ کے جسم تک۔ مثلاً ایک شخص انیون کھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے اس کی اپنی طبیعی قوتیں مضاعف اور افسردہ ہو جائیں گی۔ کسی دوسرے پر اس کا اثر نہیں پڑے گا۔

- ۲۔ ایسے اعمال جن کا اثر معاشرہ پر پڑتا ہے۔ مثلاً ایک شخص چوری کرتا ہے۔ اس کے اس عمل کا اثر معاشرہ کے دیگر افراد پر پڑتا ہے۔ اس کی روک تھام کے لئے معاشرہ قوانین مرتب کرتا ہے اور ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دی جاتی ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ایسے اعمال کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ چونکہ چوری کرنا (یا دوسروں کا مال باطل طریق سے حاصل کرنا) ایک مستقل قدر کی خلاف ورزی بھی ہے، اس لئے اس کا اثر انسان کی ذات پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَنسِفْ

تَبَسُّمًا عَلَى نَفْسِهِ۔ (۳۳) جو شخص کوئی جرم کرتا ہے تو (ہر چند وہ جرم معاشرہ کے کسی قانون کے خلاف ہوگا۔ اور اس کا نقصان کسی دوسرے فرد کو ہوگا۔ لیکن) درحقیقت، مجرم وہ جرم خود اپنی ذات کے خلاف کرتا ہے۔ اس جرم کے سلسلہ میں وہ معاشرہ کی عدالتی مشینری کی گرفت میں آتا ہے یا نہیں اور اسے وہاں سے سزا ملتی ہے یا نہیں، اس کا تعلق معاشرہ سے ہے۔ لیکن اس کا مضر اثر اس کی ذات پر بہر حال پڑتا ہے۔ اس سے وہ بچ نہیں سکتا۔

۳۔ تیسری شق ایسے اعمال پر مشتمل ہے جن کا نہ تو کوئی طبعی اثر انسان کے جسم پر مرتب ہوتا ہے (جس طرح شق اول میں بیان کیا گیا ہے) اور نہ ہی معاشرہ پر (جیسے شق دوم میں کہا گیا ہے) ان کا اثر صرف فرد متعلقہ کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی کی کوئی چیز چرانے کی نیت کرتا ہے۔ لیکن نہ اسے چراتا ہے اور نہ ہی اسے چرانے کے لئے کوئی علی اقدام کر پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی اس نیت اور ارادہ کا نہ تو کوئی طبعی اثر اس کے جسم پر مرتب ہوتا ہے اور نہ ہی یہ معاشرہ کے کسی قانون کی زد میں آتا ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ اس کی ذات پر اس کا مضر اثر مرتب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ غلط ارادہ بھی مستقبل اقدار کی خلاف ورزی میں شامل ہے۔

شق اول سے متعلق اعمال کے سلسلہ میں ہم نے (بغرض تفہیم) یہ کہا ہے کہ ان کا اثر طبعی ہوتا ہے اور ان اعمال کے مرکب تک محدود۔ لیکن بنظر غائر دیکھا جائے تو ان کا اثر ایک لحاظ سے، انسانی ذات پر بھی پڑتا ہے۔ تو ان جسم اور عمدہ صحت، اقدار خداوندی کے مطابق کام کرنے کے لئے لاینفک ذرائع ہیں، اس لئے جو اعمال انسان کی صحت اور توانائی پر مضر اثرات مرتب کرتے ہیں، وہ بھی بالواسطہ، انسانی ذات کے ضعف کا موجب بنتے ہیں۔ لہذا اس قسم کے اعمال کا اثر بھی انسانی ذات پر پڑتا ہے۔ گھوڑے کا لاغر اور موٹر کا خراب ہونا آپ کے منزل مقصود تک پہنچنے میں حائل ہو جاتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ انسان کے ہر عمل کا اثر، بالواسطہ یا بلاواسطہ، اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے اور اس کے لئے نہ تو دار و گیر کی کسی خارجی مشینری کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی عدالت کی طرف سے سزا ملنے کی حاجت۔ یہی ہے وہ مقام جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ اَيَحْسَبُ اَنْ تَكْفُرُوْا اِنْ هَدٰى رَّبُّكَ النَّاسَ يَهْتَدُوْا اِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَكٰفِرُوْنَ۔ (۳۴) یہ سمجھتا ہے کہ اسے کوئی دیکھ نہیں رہا، اگر وہ ایسا سمجھتا ہے تو وہ فریب نفس میں مبتلا ہے۔ جو اثرات اس کی ذات پر مرتب ہوتے ہیں ان کے لئے اس کی ضرورت ہی نہیں کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے یا نہیں۔ کسی کے دیکھنے یا نہ دیکھنے کا سوال اعمال کی صورت میں پیدا ہوتا ہے جو مرئی اور محسوس ہوں۔ لیکن وہاں تو یہ کیفیت ہے کہ يَعْلَمُ خَائِضَاتُ الْعُمَمِ وَمَا تُغْنِي الصُّدُورُ (۳۵) دل میں گزرنے والے خیالات اور نگاہ کی غیبتیں تک بھی چھپی نہیں رہ سکتیں۔ وہ بھی اپنا اثر مرتب کر کے رہتی ہیں۔ اس کے لئے نہ کسی سپاہی کی ضرورت ہوتی ہے، اور نہ ہی گواہ کی حاجت۔ بَلَى اِنَّ اِنْسَانَ لَّرَافِقٍۭ ذٰلٍۭ (۳۶) انسان خود اپنے خلاف آپ محاسب اور گواہ ہوتا ہے۔ اس کے لئے نہ کسی تھانے میں ہسٹری شیٹ کو لٹنے کی ضرورت پڑتی ہے، نہ بسترِ الفت یا بستہ بستر مرتب کرنے کی حاجت۔ مَحَلِّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنَةُ طَيْرٌۭ وَفِيْ عُنُقِهِ۔ (۳۷) ہر انسان کا ہسٹری شیٹ اس کی گردن میں لٹکا رہتا ہے۔ اسے کوئی

اور پڑھ کر بھی نہیں سنا۔ اِقْرَأْ كِتَابَكَ (۱۳۱) وہ اپنا اعمال نامہ خود آپ پڑھتا ہے۔ وَكَفَىٰ مَنَظْمَةً
الْبَيْعَةِ عَقِيدَتِكَ حَقِيقَةً۔ (۱۳۲) اور پھر اپنی جزا اور سزا کا حساب بھی خود ہی کرتا ہے۔

(۱)

جس طرح افراد کے معاملہ میں مستقل اقدار کی خلاف ورزی، گرفت اور سزا کا موجب بنتی ہے۔ اسی طرح
اقوام کی صورت میں بھی، ان اقدار سے سرکشی کا نتیجہ ان کی تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ اقوام بھی افراد ہی کا
مجموعہ ہوتی ہیں۔ مستقل اقدار کی خلاف ورزی سے افراد کی ذات قسحت و اضمحلال کا شکار ہو جاتی ہے
اور اس قسم کے افراد پر مشتمل قوم، اجتماعی طور پر تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے، بے شمار
مقامات پر، اقوام سابقہ کے جرائم اور ان کی وجہ سے ان کی تباہی اور بربادی کا غیرت آموز تذکرہ کیا ہے۔
ان اقوام کے احوال و کوائف بیان کرنے کے بعد، حضور نبی اکرم کے مخالفین کو مخاطب کر کے کہا گیا۔
وَلَقَدْ مَكَنَّا لَهُمْ فِي مَكَنٍّ وَإِنَّا لَمَكَنَّكُمْ فِي مَكَنٍّ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا
وَأَبْصَارًا وَآفِئِدَةً۔ فَهَآ أَغْنَىٰ عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا أَبْصَارُهُمْ وَلَا
أَفِئِدَتُهُمْ مِن شَيْءٍ إِذْ كَانُوا يَجْحَدُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَحَاقَ
بِهِمْ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ۔ (۲۲۶)

ان اقوام کو ہم نے تک میں اس قدر قوت اور ممکن عطا کر رکھا تھا کہ ایسی قوت اور
ممکن تمہیں بھی نصیب نہیں۔ انہیں دیکھنے، سننے، سمجھنے، سوچنے کی صلاحیتیں حاصل
تھیں۔ لیکن جب انہوں نے قوانین خداوندی سے سرکشی کی راہ اختیار کی تو ان کی یہ
صلاحیتیں بے کار ہو کر رہ گئیں اور جس تباہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے، اس نے انہیں
چاروں طرف سے گھیر لیا۔

ان قوموں کے جرائم کی جو تفصیل قرآن کریم نے دی ہے، وہ طول طویل ہے۔ لیکن ملخص ان کا یہ ہے کہ وَاِذَا
بَطَشْتُمْ فَبَطَأْتُمْ خَجَّاجًا بَيْنَ۔ (۲۲۷) وہ کمزوروں اور زبردستوں کو ظلم و استبداد کے آہنی
شکنجہ میں اس شدت سے جکڑتے تھے کہ ان بیچاروں کی ہڈیاں تک ٹوٹ جاتی تھیں۔ جہانگ فرد اور
معاشرہ کا تعلق ہے، ناقص ہی سہی، لیکن پھر بھی ایک معاشرتی نظام عدل ایسا ہوتا ہے جو فرد کو
انہ تکاب جرم سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن قوموں کی صورت میں اس قسم کا کوئی نظام نہیں
ہوتا جو بالادست قوم کو کمزور اقوام پر ظلم اور زیادتی سے روکے۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے)
قوموں کے نزدیک ”جنگل کا قانون“ ہی ہیج زندگی ہوتا ہے۔ یعنی اس میں ہر طاقتور کو حق حاصل
ہوتا ہے کہ کمزور کو چبا ڈالے۔ اس کے برعکس، جب کوئی ایسی قوم برسرِ اقتدار آئے جو حیات
آخرت پر ایمان رکھتی ہو تو اس کا فریضہ زندگی، بلکہ ان کے اقتدار کی وجد و جواز، یہ ہوتی ہے کہ
وہ مظلوموں کی حفاظت اور کمزوروں کی مدافعت کرے۔ وہ لوگ دنیا میں عدل کے محافظ اور انصاف
کے پاسبان بن کر جیتے ہیں۔ ان کے نزدیک، عدل کی حدود کہاں تک پھیلتی ہیں، اس کا اندازہ

اس ایک اصول سے لگا بیٹھے جس پر وہ عمل پیرا ہوتے ہیں کہ لَا يَجُوزُ مَسْكُكُمْ شَمَانًا قَوْمٍ عَلَى
 أَنْ لَا تَعْدُوهُمَا — اَعْدَاؤُكُمْ... (دیکھنا کسی قوم کا دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم
 اس سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو۔ دشمن کے ساتھ بھی عدل کرو۔ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہا
 کہ مظلوم کی فریاد کہیں سے آئے، فوراً اس کی امداد کے لئے پہنچو۔ اسے ظالم کی گرنٹ سے بچاؤ خواہ اس میں
 تمہیں اپنی جان تک بھی کیوں نہ دینی پڑ جائے۔ (۵/۳) دنیا کے ہر انسان — بلا تفریق، رنگ، نسل، زبان،
 وطن، مذہب و ملت — کی جان، مال، عزت، آبرو، عصمت، معابد کی حفاظت کرو، کہ تمہیں
 صاحب اقتدار اسی مقصد کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس قوم کے سامنے، صلاح و بعت کا اصول یہ
 ہوتا ہے کہ

وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَنَكُتْ فِي الْأَمْرِ مِنْهُ (۱۱/۱۱)

وہی قوم، وہی نظام، وہی نظریہ زندگی باقی رہ سکتا ہے جس کے پیش نظر کسی خاص قوم، خاص قبیلہ،
 خاص ملک کا مفاد نہیں بلکہ پوری کی پوری نوع انسان کی منفعت ہو۔ وہ اس اصول پر عمل پیرا ہونے سے بقا
 اور حیاتِ دوام حاصل کرتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ مغرب کا مادی نظریہ حیات اور قرآن کا حیاتِ آخرت کا نظریہ کس طرح ایک دوسرے
 کی ضد ہیں اور ان کے عملی نتائج کس طرح باہمسد گرد مخالفت! آج ساری دنیا جس جہنم میں گرفتار ہے، وہ
 مادی نظریہ حیات کا فطری نتیجہ اور اس کے شجرۃ الزقوم کا لازمی برگ و بار ہے۔ جب تک انسان اس
 نظریہ حیات کا قائل رہے گا، اس جہنم کی آگ زیادہ سے زیادہ شعلہ خیز ہوتی جائے گی۔ اس کا علاج، اس
 کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظریہ حیات کو بدل جائے اور اس کی جگہ ایمان بالا آخرت کو انسانی قلب کی
 گہرائیوں میں راسخ کیا جائے۔

لیکن، دوسروں کا ذکر کیا، یہ ایمان تو آج خود ہمارے دل کی گہرائیوں میں بھی راسخ نہیں، جو اس
 ایمان کے دعویٰ کی بنا پہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ ہم آخرت پر ایمان کے محض الفاظ دہراتے رہتے ہیں۔ اس
 ایمان کی کوئی غلطیت سی جھلک بھی ہماری عمل زندگی میں نظر نہیں آتی۔ قرآنی نظریہ حیات کو عملی زندگی کی اساس
 بنانے کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظریہ حیات کو ظہار کے نصابِ تعلیم کی اساس و بنیاد قرار دیا جائے۔
 اور اس طرح یہ ان کے تصورات و معتقدات کی رگوں میں خونِ زندگی بن کر دوڑے۔ اسی میں ہماری زندگی کا
 راز ہے اور اسی سے انسانیت کی فوز و فلاح وابستہ!

(۵)

ضرورتِ رشتہ پنجاب سے متعلق، ۲۰ سالہ، والدین کے تنہا فرزند ارجمند، حوامی لے (اردو ادب) میں اور انگریز میں
 اچھے نمبر پر فائز، کے لئے برطانوی شہریت کی حامل اور مشرقی ماحول کی پروردہ، خوش گل و شیرازہ رفیقہ حیات
 محبوب ہے جس کے لئے سوائے اس کے کہ وہ اور اس کے والدین ذات پات و فاندانی حیثیت اور دیگر مسرفانہ رسوم کی بندش سے متبرا
 مرد اور کوئی قید نہیں۔ (خط کتابت، لاہور) ۵۰ ف۔ سرت ناظم اداۃ طلوع اسلام - ۲۵/۱/۶۸ گبرگ لاہور